انتقاد

ارمغانِ سلیمان - یعنی مجموعہ کلام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے سوانح نگار "تذکرہ سلیمان" کے مصنف جناب غلام محمد صاحب نے بڑا اچھا کیا کہ سید صاحب مرحوم و مغفور کے مجموعہ کلام کو شائع کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس صدی کے نصف اوّل کی چند ایک عظیم شخصیتوں میں جنہوں نے برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں کی اسلامی، علمی، ذہنی اور تہذیبی زندگی کی تشکیل اور اُس کو جِلا دینے میں سب سے نمایاں حصہ لیا ہے، مرحوم ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ذریعہ سید صاحب نے مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے، وہ اتنی پائدار، ہمہ گیر، دُور رس اور وسیع الاثر ہے کہ برصغیر کے مسلمان اُس کے احسان کو کبھی بھول نہیں سکتے۔ دارالمصنفین اور اس کے واسطے سے سید صاحب مرحوم نے اردو زبان میں اسلامی تاریخ کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا، اور نہ صرف فراہم کیا، بلکہ اُسے ملّت کے ذہن و قلب میں ان چالیس پنتالیس سالوں میں اس طرح اُتار دیا کہ اگر ہم یہ کہیں کہ ہم میں سے اکثر دارالمصنفین کے دیئے ہوتے ذہن سے سوچتے اور اُس کے مرتب کردہ تاریخی ادب کی آنکھوں سے اپنے ماضی و حال کو دیکھتے ہیں۔ تو اس میں چنداں مبالغہ نہیں ہوگا۔

سید صاحب بنفسِ نفیس دارالمصنفین تھے، اُن کی زندگی سرتاپا اسی کے لئے وقف رہی اور خوش قسمتی یہ ہے کہ اُن کے اِس جہان سے رخصت ہونے کے بعد بھی دارالمصنفین کا فیضان جاری ہے، اور انشاء اللہ جاری رہے گا۔ اس لحاظ سے سید صاحب کی شخصیت ہمارے لئے اور بھی اہم ہو جاتی ہے اس لئے اُن کے قلمی آثار جہاں تک بھی ہو سکے، محفوظ ہو جانے چاہئیں۔ اس سے ایک تو سید صاحب مرحوم کی شخصیت کے مختلف پہلو ہمارے سامنے اُجاگر ہوتے ہیں۔ اور دوسرے ہمیں اُس

دور کے علمی و تاریخی تعین میں مدد ملتی ہے جس کی تشکیل میں مرحوم کا بہت بڑا حصہ تھا۔

"ارمغانِ سلیمان" کا پہلا حصہ جو سید صاحب کے دورِ آخر (اپریل ۱۹۴۲ء تا دسمبر ۱۹۴۹ء) کا کلام ہے۔ اور جس کا عنوان "غزل المغزلات" ہے، اُس وقت کا کلام ہے "جب اُنھوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور علم کی اقلیم سے نکل کر آسمانِ معرفت کی سیر شروع فرمائی .... اس مبارک دور کی پہلی غزل ۵۔ اپریل ۱۹۴۲ء کو ہوئی، جب کہ حضرت بیعت سے مشرف ہو کر اعظم گڑھ لوٹ رہے تھے۔ اس کا مطلع اور مقطع انقلاب روحانی کی تاریخ کو متعین کر رہا ہے:۔ ؎

پا کر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں — ہر سود و زیاں دوسرا بھول گیا ہوں

اُلٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا — افسانۂ پارینہ ولا، بھول گیا ہوں"

ہمارے نزدیک زیرِ نظر کتاب کا سب سے اہم اور قابلِ غور و توجہ یہی پہلا حصہ ہے۔ سید صاحب کی علمی و تصنیفی زندگی کا آغاز مولانا شبلی کے زیرِ اثر ہوا۔ بلکہ ایک لحاظ سے سید صاحب مولانا شبلی کے تربیت یافتہ تھے اور دار المصنفین اُن کی ہی آرزوؤں اور عزائم کا ماحصل تھا۔ بے شک مولانا شبلی کی جامع الحیثیات شخصیت تھی، وہ عالمِ دین، مورخ، محقق اور متکلم ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب اور شاعر بھی تھے۔ لیکن ایک چیز جو اُن کی ان تمام حیثیات میں نمایاں نظر آتی ہے، وہ اُن کی آزادیٔ فکر اور نقطۂ نظر کا نیا پن ہے۔ وہ افکارِ دینی کی تعبیرِ نو اور تجدید میں گو اتنے آگے تو نہیں گئے، جتنے سرسید گئے تھے، لیکن اُن کی دعوتِ علمی کی اساس یقیناً دورِ جدید کی عملی منطق اور نئے افکار تھے، اور اس کے ثبوت میں اُن کی تصانیف الکلام، علم الکلام، الغزالی، مولانائے روم، المامون اور الفاروق وغیرہ پیش کی جا سکتی ہیں۔ مختصراً مولانا شبلی کا علمی و تصنیفی مسلک ایک ایسے عالمِ دین کا تھا۔ جو ماضی کی علمی وراثت کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کے علم و دانش کو بھی اپنانے کے لئے تیار ہوں۔ اور ایک لحاظ سے اگر ہم اُنہیں بیسویں صدی کا معتزلی عالم کہیں تو بے جا نہیں ہوگا۔

سید صاحب کی علمی زندگی کی ابتدا اس ذہنی ماحول میں ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں جب وہ ندوہ میں طالب علم تھے تو مولانا شبلی کی ندوہ میں آمد پر اُنھوں نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس

کے یہ شعر خاص طور سے قابلِ توجہ ہیں ۔

صریرِ خامہ اش نغمہ سرائے گلشنِ حکمت　　مدادش از پئے چشم ورق کحل صفاہانی
سنانِ خامہ اش کشور کشائے معنی و دانش　　زبانگِ طبلِ صیتش پُر فضائے کون امکانی
دلش آرام گاہے موجِ دریائے معانی را　　ہویدا بحرِ حق منفصلات از خطِ پیشانی
مسیحا دم، با عجازِ قلم، جان دگر بخشد　　بحکمِ قُم باذن العلم آں تن راکہ شد فانی

ان اشعار میں سید صاحب نے اپنے اُستاد کی حکمت آفرینی، اُن کے قلم کے کشورکشائے معنی و دانش اور اُن کے دل کے دریائے معانی کی موج کا مرکز ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ وہ مسیحادم تھے اور اپنے اعجازِ قلم سے تنِ فانی میں باذن العلم کے حکم قُم سے نئی جان بخشتے تھے۔

مولانا شبلی کا دار العلوم ندوۃ العلماء کے نصابِ تعلیم اور اُس کی دوسری خصوصیات کے بارے میں قدیم مسلک کے علماء سے جو شدید اختلاف ہوا۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ پھر سر سید کے روایتی سیاسی مسلک کے خلاف اُنہوں نے جو نظمیں لکھیں، وہ اب تک بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں سلہ ۔

بے شک سید صاحب شروع میں اپنے اُستاد ہی کی راہ پر چلے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء میں

سلہ زیرِ نظر کتاب میں "مسٹر مظہر الحق" اور "مسٹر محمد علی جینا" عنوان کی سید صاحب کی دو نظمیں اپنے اُستاد کے اسی مسلک کی عکاسی کرتی ہیں۔ آخر الذکر نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

اک زمانہ تھا کہ اسرارِ دروں مستور تھے　　کوہ شملہ جن دنوں ہم پایۂ سینا رہا
جب کہ داروئے وفا ہر درد کا درماں رہی　　جبکہ ہر نا داں عطائی بو علی سینا رہا
جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اُسے　　جس پر اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادۂ حبِ وطن کچھ کیف پیدا کر سکے　　دَور میں یونہی اگر یہ ساغر و مینا رہا
علتِ دیریں سے گو اصلی قویٰ بیکار ہیں　　گوش شنوا ہے، نہ ہم میں دیدۂ بینا رہا
پر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ اُمید　　ڈاکٹر اُس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

(لکھنؤ سنہ ۱۹۱۶ء)

تحریک خلافت و عدم تعاون کے دَوران وہ مولانا محمد علی کے ساتھیوں میں سے تھے، اور ان کے ساتھ وہ وفد خلافت میں یورپ بھی تشریف لے گئے۔ اور اُس وقت اِس راہ کے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی شدید ترین مخالفوں میں سے تھے۔ بعد میں بھی سید صاحب ایک عرصے تک علماء اور ارباب سیاست کے اُسی گروہ سے وابستہ رہے جو حضرت تھانوی کے مسلک کا کلیتہً مخالف تھا، لیکن ۱۹۴۲ء میں سید صاحب میں ایک "انقلاب روحانی" آتا ہے اور وہ حضرت تھانوی سے بیعت ہوتے ہیں۔ (بعد از بیعت در تھانہ بھون) اُنہوں نے جو غزل کہی۔ اُس کے دو شعر یہ ہیں ؎

اے رہبرِ توفیق، مجھے راہ بتا دے — نقشِ قدم راہ نما بھول گیا ہوں
اے خضر! مرا قافلہ کس سمت چلا ہے — تیزِ صدا ہائے درا بھول گیا ہوں

اس کے تین دن بعد (۸ اپریل ۱۹۴۲ء) کی ایک غزل کا ایک شعر ہے ؎

تھی جو آزادی تو ہر سُو دوڑ تھی — قید میں آرام ہی آرام ہے

اُنہی دنوں کا ایک اور شعر ہے ؎

مدرسہ چھوڑ، خرابات میں آ کر بیٹھا — دوسرا سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں

اسی مضمون کے دو اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

قیل و قال مدرسہ کو چھوڑ کر — شیخ بھی رندوں میں اب شامل ہوا
آج ہی پایا مزا ایمان کا — جیسے قرآں آج ہی نازل ہوا

حضرت تھانوی سے بیعت کے بعد اُن کی کیا روحانی کیفیات تھیں۔ اُن کی ایک جھلک اس غزل سے ملتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مجھ پہ جادو یہ چلایا کس نے — مجھ کو دیوانہ بنایا کس نے
میں تھا آسودۂ خوابِ غفلت — مجھ کو سوتے سے جگایا کس نے
اپنا ہر داغ نظر میں آیا — ایسا آئینہ دکھایا کس نے
عشق کی راہ، یقیں کی منزل — مجھ کو یہ راز بتایا کس نے
کھو گئی عقل و خرد کی دنیا — جامِ سرشار پلایا کس نے

اب کچھ آباد ہے دل کی بستی — اس خرابہ کو بسایا کس نے
دل تھا مردہ لحدِ سینہ میں — اس کو قم کہہ کے جلایا کس نے
جس کو تھا آٹھ پہر کا رونا
ایسے روتے کو ہنسایا کس نے (۲۰ جولائی ۱۹۴۲ء)

ایک روایت ہے کہ جب سید صاحب حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے تھے، تو انہوں نے اپنی اُن تمام تحریروں سے رجوع کر لیا تھا، جو حضرت تھانوی کے مسلک کے خلاف تھیں۔ گویا اُن کا حلقۂ تھانوی میں آنا دبستانِ شبلی سے کنارہ کشی کے بعد ہی ممکن ہو سکا۔

سید صاحب کا کم و بیش تیس پینتیس سال تک "مدرسہ" کی شاندار زندگی گزارنے کے بعد جب کہ وہ خود ہی صاحبِ "مدرسہ" اور تمام اہلِ "مدرسہ" کے مرجع بھی ہوں، "مدرسہ" کو چھوڑ کر اُن کا "سایۂ دیوار" کی تلاش میں "خرابات میں آ کر" بیٹھ جانا، کچھ عجیب معلوم ہوتا ہے اور چوں کہ یہ معاملہ سید سلیمان جیسے صاحبِ اثر اور مکتبِ شبلی کے سربراہ بزرگ کا ہے، اس لئے یہ خاص طور پر ہمارے لئے جاذبِ توجہ ہے، صاف الفاظ میں یہ "مدرسہ" کی شکست ہے۔ اس "مدرسہ" سے سید صاحب کو نہ دل کا سکون ملا، اور نہ ایمان کا مزا۔ بقول اُن کے یہ سب "قیل و قال" تھی۔ اس سے دل کی بستی خراب ہی رہی۔ اور اُسے نہ عشق کی راہ ملی نہ یقین کی منزل۔ ناچار انہیں "در پیرِ مغاں" کا رُخ کرنا پڑا۔ اور "آزادی" کے بجائے اُنھوں نے "قید" کو ترجیح دی، کیونکہ اس میں اُن کے لئے "آرام ہی آرام" تھا۔

"آرام" کے لئے "قید" کو ترجیح دینا خواہ روحانی لحاظ سے کتنا بھی عظیم کارنامہ ہو۔ لیکن یہ ایک شخصیت کی اور خاص کر جب وہ سید سلیمان جیسے بزرگ کی شخصیت ہو، جو سالہا سال تک ایک مدرسۂ فکر اور مکتبِ تصنیف و تالیف کے امام رہے ہوں، شکست ہی ہے۔ اسی شکست کے احساس نے سید صاحب کو "سایۂ دیوار" ڈھونڈنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ جب وہ آستانہ تھانہ بھون میں پہنچے، تو اُنہیں وہ مرادِ حاصل ہو گئی۔

حیاتِ نو مجھے اُن کی نگاہِ ناز نے بخشی — بھرا ہے آبِ حیواں کاسۂ زہرِ ہلاہل میں
جو موسیٰ بھی ہوں تو بھی اتباعِ خضر لازم ہے — ھدایت منحصر ہے اتباعِ شیخِ کامل میں

بے شک سید صاحب کو حضرت تھانویؒ سے وہ سب کچھ مل گیا جس کے لئے اُن کی جان بے قرار تھی اور اس اعتبار سے اسے سید صاحب کی واقعی کامیابی سمجھنا چاہیئے۔ لیکن اگر اُسے "مدرسہ" کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، تو یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ صرف ایک فرد کا نہیں، بلکہ اُس پورے مکتب فکر کا جس کی طرح مولانا شبلی نے ڈالی تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر میں سرسید نے ملک کے بدلے ہوئے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حالات اور نئے فکری و ثقافتی تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اسلامی معتقدات و افکار کی نئی تعبیر کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش اُن کی زندگی ہی میں زینتِ طاق نسیاں ہو کر رہ گئی۔ سرسید کے بعد مولانا شبلی نے اُن کے انحرافات سے بچتے ہوئے قدیم اور جدید کا ایک مرکب تیار کرنے کا تہیہ کیا۔ اس ضمن میں وہ ایک راہ بھی متعین کر گئے۔ اور بعد میں آنے والوں کے لئے دارالعلوم ندوہ اور اپنی تصنیفات کی ایک شمع بھی جلا گئے۔ سید صاحب اور دارالمصنفین کے دوسرے ارکان کے خلوص، محنت، ایثار اور عزم صادق سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے ہم حالات کی ستم گری کہیں گے کہ مولانا شبلی کے یہ جانشین الکلام، علم الکلام، الغزالی، اور المامون کے سلسلے کو آگے نہ بڑھا سکے، بلکہ اُن کو رجعتِ قہقہری پر مجبور ہونا پڑا۔

زیر نظر کتاب "ارمغانِ سلیمان" کے پہلے حصہ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے بڑا سبق آموز ہے۔ برصغیر میں مکتبِ شبلی کو مولانا شبلی کے بعد جن حالات سے دوچار ہونا پڑا، مصر میں شیخ محمد عبدہ کی دعوتِ اصلاح کا بھی یہی انجام ہوا۔ سید سلیمان ندوی کی طرح شیخ محمد عبدہ کے جانشین شیخ رشید رضا عمر بھر قدامت پسندوں کے مقابلے میں تجدد پسندوں کے زیادہ خلاف رہے، حالانکہ اُن کے اُستاد کا رویہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ ہندو پاکستان اور مصر کی طرح دوسرے ملکوں میں بھی مسلمانوں کی اصلاح پسند اور ترقی خواہ مذہبی تحریکوں کا کم و بیش یہی حشر ہوا۔ اور آخر میں تجدد کو قدامت کے دَر پر جبہ سائی کرنی پڑی۔

ایسا کیوں ہوا؟ "فکر و نظر" کے گزشتہ شمارے میں شائع شدہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ایک مقالے میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس پر ہم یہ اضافہ کریں گے کہ سید صاحب کی علمی و تصنیفی زندگی کی اُٹھان بڑی شان دار تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران جب مولانا محمد علی

نظر بند تھے، تو وہ سید صاحب کو برابر خط لکھتے رہتے تھے۔ جن میں سیرت النبیؐ کے بارے میں مشورے ہوتے تھے۔ اُنہی دنوں رسالہ "معارف" کی ترتیب و تدوین میں مولانا عبدالماجد دریا بادی بھی انگریزی زبان سے تراجم کی شکل میں اُن کا اکثر ہاتھ بٹایا کرتے تھے، پھر سید صاحب کو یورپ کے سفر کا موقع ملا۔ اور برصغیر اور اسلامی ممالک کی سیاسیات میں بھی وہ باقاعدہ حصہ لیتے رہے۔ بعد میں ایک طرف تو ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ اور دوسری طرف پہلے ابن سعود کے معاملے میں خود مسلمانوں میں ٹھن گئی۔ پھر اسی قسم کے اور بھی جھگڑے شروع ہو گئے جنہوں نے سید صاحب کو حد سے زیادہ ملول اور دل شکستہ بنا دیا۔ آخر عوام کی ان شورشوں سے اُکتا کر وہ سکونِ قلب کے متلاشی ہوئے، اور وہ انہیں حضرت تھانوی کی بیعت سے حاصل ہو گیا۔

"ارمغانِ سلیمان" اس "انقلابِ روحانی" اور ہمارے نزدیک اس حسرت ناک سانحہ کی ایک منظوم داستان ہے اور چونکہ یہ ایک عظیم شخصیت کی ہے، اس لئے ہمارے خصوصی مطالعہ کی مستحق ہے۔

بڑے سائز کے ۱۱۲ صفحات۔ غیر مجلد۔ قیمت تین روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ سید محی الدین احمد۔ ۹-۱ عالمگیر روڈ۔ شرف آباد، کراچی ۵۔

(محمد سرور)

طابع: ظہیر الدین — مطبع: استقلال پریس لاہور
ناشر: ڈاکٹر فضل الرحمٰن، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، راولپنڈی